پروفیسر ہارون خان شروانی

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا حیدر آباد دکن میں قیام

جامعۂ عثمانیہ کے قیام سے پہلے میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے واقف نہ تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جامعۂ عثمانیہ قائم ہوا اور میرا تقرر "مددگار" پروفیسر تاریخ کی حیثیت سے کیا گیا۔ مجھے ۱۴ر اگست کو حیدرآباد پہنچنا تھا۔ اس سے چار چھ دن پہلے علیگڈھ میں عبدالمجید خواجہ صاحب کی کوٹھی حبیب باغ میں (جو اب مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کا اقامت خانہ ہے) خواجہ صاحب کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ جو ان دنوں کالج کے میڈیکل افسر تھے آئے اور وہ بھی ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ حیدرآباد دکن کب جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ۱۰ر کو جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بہت اچھا ہوا، میرے نسبتی بھائی خلیفہ عبدالحکیم بھی اسی ریل سے جا رہے ہیں آپ کا ان کا ساتھ ہو جائے گا۔ وہ جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے "مددگار" پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے دہلی میں ملیں گے۔

خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ حیدرآباد پہنچے۔ ایک ساتھ اپنے اپنے کام کا "جائزہ" لیا۔ کئی سال ایک ہی جگہ رہے۔ ایک ہی ہفتے میں دونوں کی شادیاں ہوئیں۔ جامعۂ عثمانیہ کے طلبہ نے ایک ہی تاریخ میں دونوں کو مبارکبادی عصرانہ دیا، اور پرلطف بات یہ ہے کہ خلیفہ نے اس عصرانے میں میرا بنارسی شملہ زیب سر کیا۔ چنانچہ اس عصرانے میں ہم دونوں کی جو تصویر لی گئی وہ اس وقت تک میرے کمرے میں بھولے بسرے زمانے کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ ہم دونوں کی تنخواہیں زیادہ نہ تھیں اس لیے ہم نے وحیدالرحمٰن "مددگار" پروفیسر طبیعیات کے ساجھے میں ایک وسیع بنگلہ کرائے پر لیا۔ ہم دونوں مجرد تھے اور وحیدالرحمٰن متاہل، مگر ان کی بیگم حیدرآباد نہیں آئی تھیں۔ مکان وسیع تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو دو دو کمرے اور ایک ایک غسل خانہ ملا۔ اس کے علاوہ کھانے اور بیٹھنے کے کمرے مشترک تھے۔ مکان کے عقب میں ایک بڑا خانہ باغ تھا جس میں مختلف قسم کے پھلدار درخت تھے۔ میرے متعلق جو کمرے تھے وہ اس باغ کے بالکل محاذ میں تھے، اور میری کھڑکیوں سے پورا باغ نظر آتا تھا۔ خلیفہ سے اپنے کمروں میں صبر نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جامعہ کے اوقات سے علاوہ اپنا بیشتر وقت باغ میں بسر کرتے

تھے۔ ہمیشہ ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی یا پنسل کاغذ۔ پنسل کاغذ اس لیے کہ کسی شعر یا نظم کے لیے طبیعت موزوں ہو تو کمرے سے لانا نہ پڑے۔ میں نصاب کی کتابوں کا ذرا زیادہ مطالعہ کرتا تو مجھے کمرے سے کھینچ لے جاتے اور کہتے بھائی ابھی تو صرف انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں ہیں! اگر اس وقت مطالعے کا یہ عالم ہے تو جب بی۔اے۔ ایم۔اے کو پڑھانا پڑے گا تو تم اپنے آپ کو بالکل ہلاک ہی کر ڈالو گے۔

میری اور خلیفہ کی عمر میں کم وبیش ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ وحیدالرحمٰن عمر میں ہم دونوں سے ذرا بڑے ہوں گے۔ خلیفہ کی طبیعت میں جوانی بھری ہوئی تھی تو وحیدالرحمٰن نسبتاً سنجیدہ تھے۔ بہت سے نوجوان فلسفی شعراء کی طرح خلیفہ کے مزاج میں بھی ذرا لاابالی پن تھا مگر کپڑے وہ نہایت نفیس پہنتے تھے۔ تازہ ولایت قسم کے لوگوں کی طرح پتلون کی شکن، ٹائی، کالر کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ مگر دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے ان کا دوپہر کا قیلولہ ناغہ نہ ہوتا تھا۔ ہمارے "گھرانے" میں جتنا فرنیچر تھا وہ سب کا سب کرائے کا تھا۔ پلنگ، کرسی، میز، برتنوں کی الماریاں، کتابوں کی الماریاں، یہاں تک کہ غسل خانوں کا پورا سامان کرائے کا تھا۔ صرف کھانے کے برتن، چھری کانٹے، چمچے میرے تھے۔ کرائے کے فرنیچر کا انتخاب وحیدالرحمٰن نے کیا تھا جن کا مزاج ذرا نوابانہ تھا۔ چنانچہ ہم میں سے ہر ایک کو فرنیچر کے کرائے کے چالیس پینتالیس روپے ماہوار دینے پڑتے تھے۔ ایک روز خلیفہ نے کہا کہ بھائی ہم اس نوابانہ ٹھاٹھ سے باز آئے، ہمیں اپنی چیزیں خرید لینی چاہئیں۔ حیدرآباد میں ایک اہم ادارہ حراج خانوں کا تھا۔ بیسیوں حراج خانے تھے اور ان میں سوئی سے لیکر موٹریں اور ہاتھیوں تک نیلام ہوتی تھیں۔ خلیفہ نے کہا کہ میں حراج خانے جاکر فرنیچر ہی نہیں بلکہ برتن بھی خرید لاتا ہوں۔ برتن میرے پاس تھے میں نے کہا برتن خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب دیا کہ کل تمہاری بیگم آجائے گی تو برتن تو دے جائیں گی، پھر ہم کیا ٹھیکروں میں کھائیں گے؟ غرض وحیدالرحمٰن اور میں نے خرید اشیاء کا کام خلیفہ کے سپرد کیا۔ حراج عموماً چھٹی کے دن جمعہ کو ہوا کرتے تھے خلیفہ صاحب ناشتے کے بعد چل دیئے اور دس گیارہ بجے سے سامان آنا شروع ہو گیا۔ ان میں بے جوڑ رکابیاں ڈرائنگ روم کے لیے تین طرح کی کرسیاں اور صوفہ، کھانے کے کمرے کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا کرسی میٹ ٹین کے چمچے چمچیاں، ایک بہت بڑا سنگ مرمر کا شیر، اندر والے برآمدے کے لیے (جس کا نام ہم نے ٹیپو سلطان کے مہمان خانے کے نام پر "دریائے دولت" رکھ چھوڑا تھا) نہایت خوبصورت مگر نہایت بے آرام کرسیاں، نہ جانے کتنے فریم جن میں طرح طرح کی تصویریں، زیادہ تر مناظر اور خوش رو اور بدصورت دونوں وضع کی لڑکیوں کی تصویریں اور خدا جانے کیا کیا متفرق چیزیں جو آنی شروع ہوئیں تو برابر مغرب کے

وقت تک آتی رہیں۔ مغرب سے ذرا پہلے خلیفہ مسکراتے ہوئے آئے۔ ہم نے کہا کہ بھائی یہ کیا خاک بلا اٹھا لائے ہو۔ ایک طرف تو سنگِ مرمر کا شیر اور دوسری جانب یہ ٹین کے کمچھے کس غرض سے خریدے گئے ہیں ؟ خلیفہ نے نیم سنجیدہ اور نیم مزاحی انداز میں کہا کہ کمچی چمچے میں نے دیکھے تھوڑا ہی تھے۔ حراج کرنے والے کی، میں نے بولی بول دی۔ میں نے سمجھا کہ الکٹرو پلیٹ ہوں گے۔ خیر اب ہم اگلے حراج میں انہیں تعریف کی، میں نے بولی بول دی۔ میں نے سمجھا کہ الکٹرو پلیٹ ہوں گے۔ خیر اب ہم اگلے حراج میں انہیں بھیج دیں گے !

ہم تینوں کا ساتھ چند مہینوں بعد چھوٹ گیا۔ وحید الرحمن وظیفہ لے کر یورپ چلے گئے۔ خوش قسمتی سے اردو کے مشہور ادیب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی (ولد مولوی ذکاء اللہ صاحب) دارالترجمہ کے ناظم بن کر حیدرآباد آ گئے اور ہم دونوں نے ایک بنگلہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قریب لے لیا۔ خلیفہ صاحب بھی ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ یہ زمانہ خلیفہ کی شاعری کے اوج کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ شام کے وقت ہمارے بنگلے میں کلب کی سی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ جامعہ کے اساتذہ، دارالترجمہ کے مترجم اور بعض دوسرے علم دوست اصحاب جمع ہوتے تھے۔ اور خلیفہ کی بذلہ سنجی، مزاح آفرینی، حاضر جوابی، اور شاعری سے فضا گونج جاتی تھی۔ کبھی کبھی رات کے دو ڈھائی بجے خلیفہ کے کمرے سے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔ اسی وقت اشعار موزوں ہو جاتے اور دوسرے دن مغرب کے بعد سنائے جاتے۔ رفتہ رفتہ خلیفہ کی مانگ حیدرآباد کی محفلوں میں ہونے لگی۔ بیاض کافی ضخیم تھی اور اکثر گاڑی میں رکھی رہتی تھی۔ اور وقت پر منگالی جاتی تھی۔ اس بیاض میں قومی، مزاحی، تعلیمی، شخصی غرض ہر طرح کی نظمیں ہوتی تھیں۔ اور موقع کی مناسبت سے پڑھ دی جاتی تھیں۔ بعض نظموں میں مزاح کے پردے میں بڑی کام کی باتیں ہوتی تھیں۔ جب گاندھی جی نے ہندوستان کی نجات کو چرخے کے ساتھ وابستہ کیا اور چرخہ کانگریس کے ترنگے میں چسپاں کیا گیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی نظم

"چل میرے چرخے چرخ چوں"

موزوں کی جو قوم پرست اور انگریز پرست دونوں طرح کی محفلوں میں مقبول ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ نظم راقم الحروف کے پاس نہیں ہے ورنہ اس سے اس کا اندازہ ہو جاتا کہ خلیفہ مزاح کے پیرائے میں بھی کتنی گہرائیوں تک پہنچ جاتے تھے۔

تقریباً ایک سال کے بعد یہ تالوث مقدس بھی ٹوٹ گیا۔ میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانے کا مؤدب مقیم (وارڈن) مقرر ہوا اور مجھے اقامت خانے ہی میں رہنا پڑا۔ مگر یہاں بھی خلیفہ کا اور میرا ساتھ نہیں چھوٹا اس لیے کہ وہ میرے ساتھ مؤدب غیر مقیم مقرر ہوئے اور اس بہانے سے ہفتے میں کم سے کم دو روز (جب وہ اپنی مؤدبی کے فرائض پورے کرنے کے لیے اقامت خانے آتے) ان سے لطفِ ملاقات رہتا۔

اسی دوران میں ہم دونوں کی شادیاں ہوگئیں اور میں نے مؤدبی کو خیر باد کہا۔ خلیفہ صاحب نے بھی عنایت اللہ صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک الگ بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ مگر انہیں کہیں نہ کہیں تو اپنی تقریر اور اپنے علم مجلس کے جوہر دکھانے تھے۔ اب ان کی آماجگاہ اساتذہ کا کامن روم بن گیا۔ شعبۂ دینیات کے منطق کے استاد مولوی سید ابراہیم صاحب اور خلیفہ میں خوب خوب چوٹیں رہتی تھیں۔ مولوی صاحب کی منطق وہی جامعہ نظامیہ والی منطق تھی جس پر انہیں لاثانی عبور حاصل تھا۔ حدیث، منطق، فلسفہ، کلام سب کی درسی کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ یاد تھے۔ ان کے استدلال کے طریقے خلیفہ کے استدلال کے طریقوں سے بالکل جدا تھے۔ اور بحث ہوتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں گویا میز کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں پکڑ سکتا۔

یہ بھی خلیفہ کی جدت یا جودت تھی کہ انہوں نے تین مرتبہ حیدرآباد کو خدا حافظ کہا اور تینوں مرتبہ اپنا تمام اثاثہ (جن میں دہ حراج والی تصویریں بھی شامل تھیں) فروخت کر دیا۔ ایک مرتبہ تعلیمی رخصت پر یورپ کا سفر، پھر سرینگر میں مہاراجہ کالج کی صدارت، غرض ہر مرتبہ لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے خلیفہ "سبکدوش" ہو کر یہاں سے گئے۔ ایک بہت بڑا بنگلہ بنا لیا تھا وہ بھی فروخت کر دیا۔ اسٹاف اور طلبہ دونوں میں ہر دلعزیز تھے اس لیے ہر مرتبہ رخصتانے ہوئے، دعوتیں ہوئیں، عصرانے ہوئے۔ سرینگر کی ملازمت پسند نہیں آئی تو حیدرآباد واپس لوٹے اور یہاں میر شعبہ فنون (ڈین فیکلٹی آف آرٹس) مقرر ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں میں نے نظام کالج کی پرنسپلی سے وظیفہ لے کر دہلی کے اینگلو عربک کالج کی پرنسپل کا جائزہ لیا۔ وہاں ۱۹۴۷ء کے ہنگامے تک رہا۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کی ایک ذیلی مجلس کے ممبر کی حیثیت سے پانچ مہینے دہلی میں قیام کرنا پڑا۔ جون ۱۹۴۸ء میں واپس حیدرآباد ہوا تو حکومت حیدرآباد کے ایما سے میری بازماموری جامعۂ عثمانیہ میں ہوگئی اور مجھ سے شعبۂ سیاسیات کی تنظیم کے لیے کہا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خلیفہ میر شعبۂ فنون بنے بیٹھے ہیں۔ سیاسیات کے شعبے کا وجود ہی نہ تھا اس لیے اس کے لیے نہ لیکچر روم نہ اسٹاف نہ صدر شعبہ کے لیے کوئی کمرہ۔ میں نے خلیفہ سے کہا کہ بھائی میں کہاں بیٹھوں۔ کہنے لگے کہ تم اور مجھ سے پوچھو! جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ اور نہ ملے تو نکال لو!! جگہ نہیں تھی اس لیے کہیں نہ کہیں سے مجھے نکالنی پڑی!

چند مہینے بعد خلیفہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے کبھی بھی اس کو نہیں چھپایا کہ وظیفے کے بعد وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ طلبہ نے انہیں رخصتانہ عصرانہ دیا اور جس روز وہ حیدرآباد سے جا رہے ہیں اس روز وائس چانسلر انہیں

خدا حافظ کہنے آئے۔

جیسا میرے عزیز دوست شاہد حسین رزاقی صاحب نے رسالہ ثقافت میں لکھا ہے، خلیفہ کے جوہر عمر کے آخری حصے میں کھلے۔ میں مارچ ۱۹۵۳ء میں کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے لاہور گیا تھا۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ خلیفہ سے ملنے ۲۱ وارث روڈ گیا۔ اپنے آنے کی میں نے انہیں پہلے سے کوئی اطلاع نہیں کی تھی۔ رات کے وقت باہر کے باغیچے میں کتاب دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ پرانے قصے یاد دلائے۔ حیدرآباد میں ہر ایک کا حال دریافت کیا۔ دوسرے دن مجھے کراچی جانا تھا۔ اس لیے ان سے صرف ایک ہی مرتبہ ملاقات ہوسکی ستمبر ۱۹۵۷ء میں میرا پھر لاہور جانا ہوا۔ اس مرتبہ خلیفہ سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اپنا ادارہ دکھایا۔ وہاں کے سب کارکنوں سے ملایا۔ شیخ محمد اشرف صاحب کے یہاں عصرانے پر اور بیگم رفیع کے یہاں عشائیے پر ملاقات ہوئی۔ شاید آخری مرتبہ میں نے خلیفہ کو حمید الظفر صاحب کے یہاں ظہرانے پر دیکھا۔ نہ جانے کیوں چلتے وقت میرے اوپر ایک خاص اثر تھا۔ اور یہ خیال تھا کہ شاید اب ملاقات نہ ہو۔ ۱۹۵۷ء میں خلیفہ صاحب کی طبیعت میں میں نے بدیہی فرق پایا۔ ان کی بذلہ سنجی اور شاید حاضر جوابی کی بھی وہ کیفیت نہیں رہی تھی جو جامعہ عثمانیہ کے دور میں نمایاں تھی اور اس کے بجائے ان کے چہرے بشرے سے ایک عالمانہ کیفیت مترشح ہوتی تھی۔ میں نے کہا کہ ہندوستان میں تمہاری کتابوں، خاص کر اسلامک آئیڈیالوجی اور فکر اقبال کی کافی مانگ ہے۔ تو اس سے بہت خوش ہوئے۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے قیام میں جو دقتیں پیدا ہوئیں انہیں تفصیل سے بیان کیا اور کہا انشاء اللہ آئندہ اس کام کو اس سے بھی زیادہ پھیلایا جائے گا۔

ہمارے پہلے ثالوث میں سے وحید الرحمٰن اور خلیفہ دونوں چل بسے، بلکہ شاید ان لوگوں میں سے جو کلیہ جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے موقع پر ۲۸ راگست ۱۹۱۹ء میں موجود تھے ان میں شاید میں ہی تن تنہا اس دنیائے فانی میں رہ گیا ہوں۔ رہے نام اللہ کا۔

اسلام کا نظریۂ حیات

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر صاحب کی انگریزی تصنیف "اسلامک آئیڈیالوجی" کا ترجمہ ہے۔ کتاب خوشنما ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت آٹھ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور